ہماری مجلسیں

مولانا رضی الدین حیدر صاحب بانی یادگار حسینی انٹر کالج الٰہ آباد

انسان کے لئے خوشی وغم کے جذبات بھی ذاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک شخص جس طرح کسی ایک بات سے خوش اور دوسری بات سے رنجیدہ وافسردہ ہوتا ہے لازم نہیں کہ دنیا کا ہر شخص اسی کی طرح ان باتوں سے خوشی وغم کے تاثرات محسوس کرے۔ ایسے اختلاف کی بیشمار مثالیں قریب ودور بلکہ ایک خاندان ایک گھر کے افراد میں ملتی ہیں۔ یہ فرق طبیعتوں کے اختلاف کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسلام جو ایک ہمہ گیر انسانی برادری کا علمبردار ہوکر آیا تھا اس نے کیفیات شادی وغم کے ذاتی جذبات کو بھی ایک ہی سمت میں موڑنے اور ان کے اظہار میں یک رنگی پیدا کرنے کو ضروری سمجھا تا کہ ایک ہیئت اجتماعی پیدا ہو اور کم از کم خاص موقعوں پر ہی معاشرہ تفریق وتفرید سے بچ کر ترتیب وتنظیم کے دائرہ میں آسکے۔ اس خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اسلام میں کچھ عیدیں خوشی کے لئے قرار پائیں اور کچھ عظیم سانحات غم کے لئے مخصوص ہوئیں تا کہ افراد ملت مشترک طور سے شادی وغم کے فطری مظاہرات میں حصہ لے سکیں۔ غالباً ایسا کرنے میں دوہرا فائدہ تھا یعنی اندرونی طور پر افراد کی شیرازہ بندی کا کام بلاارادہ انجام پاتا رہے اور خارجی دنیا کے لئے ایسے مظاہرات قوت اجتماعی کا احساس دلائیں اور ان کے لئے شوکت اسلامی اور عظمت قومی کا اثر ظاہر کریں۔

شیعوں کی قومی اور مذہبی زندگی بھی ایسے ہی دو اہم واقعات سے شادی وغم سے مرتبط ہے۔ ایک غدیر کا سرور افزا واقعہ ہے جس میں امیرالمومنین حضرت علیؑ کی ولایت ووصایت کا کھلے عام اعلان کیا گیا تھا۔ یہ ہماری قومی زندگی کے آغاز کا پہلا نقطہ تھا۔ دوسرا واقعہ کربلا کا الم انگیز سانحہ ہے جس میں پیغمبرؐ اسلام کے نواسے حضرت امام حسینؑ نے اپنے اعزہ واقارب واصحاب کو لے کر انسانی اقدار اور دینی مسلک کے تحفظات کی خاطر اپنی جانوں کی قربانیاں پیش فرمائیں۔ یہی وہ دو قومی عناصر ہیں جن سے ہماری قومی زندگی کی تشکیل ہوئی ہے۔ خوشی اور غم کے اتنے گہرے اور عظیم نشانات کے درمیان ہماری قومی زندگی جنم لیتی ہے، پنپتی، پھولتی پھلتی اور بالآخر اسی حد کے اندر ختم ہوجاتی ہے۔ ہمارے بزرگوں کے لئے ان کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ دنیا کی ہر چیز اور ہر فائدہ پر اسے ترجیح دیتے تھے۔ اور اس معاملہ میں کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ مگر ادھر کچھ عرصہ سے صورتحال میں تبدیلی آچکی ہے۔ حالانکہ لفظی اظہار کی حد تک آج بھی افراد ملت اس خیال سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ شاید یہ مجبوری ہو۔ جب اسی قوم میں پیدا ہوگئے ہیں تو جب تک اس سے علاحدگی کا بالکل اعلان نہ کردیں اسی ملت میں شامل رہنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟ اس شمولیت سے مردم شماری میں اضافہ تو ہوجاتا ہے مگر عملاً کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ اکثر وہ لوگ جو اظہار سے بھی کترا جاتے ہیں تو ان کے اندر قومی غیرت اور مذہبی عظمت کے احساسات کی تلاش بے سود ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ قومی جذبہ کے بغیر قومی زندگی کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ اس سلسلہ میں پہلی

اور اہم بات یہ ہے کہ ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر قربان ہونا چاہئے۔ بظاہر یہ نقصان کی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقتاً فرد وشخص کے لئے بھی یہ فائدہ مند ثابت ہوگی کہ اس کی قوم سرسبز وشاداب ہو، پھولے پھلے اور ترقی کرے۔ کسی فرد واحد کی ترقی وکامیابی خواہ نقطۂ کمال تک ہی کیوں نہ پہنچ جائے لیکن اس کی قوم مجموعی طور پر ناکامی ونامرادی کے غار میں گرتی چلی جارہی ہو تو اس کی کامیابی بھی بے معنی ہوکر رہ جائے گی بلکہ عین ممکن ہے کہ اس کی کامیابی کو بھی خطرہ لاحق ہوجائے جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔

افلاطون اور ارسطو کے فلسفیانہ نظریات نے فرد اور جماعت کے باہمی رشتوں پر بڑی صاف روشنی ڈالی ہے اور قومی واجتماعی زندگی کے تعلق سے بڑے قابل قدر مقالے تحریر کئے ہیں جو اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ فرد کے حقوق کی حفاظت کے لئے بھی جماعتی مفاد کی حفاظت کو ترجیح حاصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ایک فرد کو صرف اپنے ہی اچھے برے سے مطلب نہ رکھنا چاہئے بلکہ وسیع تر دائرہ میں پوری قوم کی فلاح وبہبود مدنظر رہنا چاہئے۔ ہماری مجلسیں جو مذہبی اور قومی اجتماع کی شکل میں منعقد ہوتی چلی آرہی ہیں ان مقاصد کو بیش از بیش محفوظ رکھنے کا یقینی ذریعہ تھیں۔ امراء اور غرباء ایک ہی فرش عزا پر ساتھ بیٹھتے اور ایک دوسرے کے حالات کا ذاتی مشاہدہ کرتے اور قومی سطح پر جو مسائل پیدا ہوتے ان کو دیکھتے سمجھتے اور حل تلاش کرنے کے راستے حاصل کرتے۔ اس بارے میں نمایاں کردار مقرر اور واعظ کا ہوتا جو فضائل اہلبیتؑ اور تعلیمات معصومینؑ کے مختلف گوشے پیش کرتے جن سے قوم کی دینی اور دنیاوی زندگی کو سنوارنے کے اصول ملتے۔ بیان کا آخری جزو مصائب سید الشہداء ہوتا جو مجمع کو متاثر بنا کر رقت خیز حالت میں چھوڑتا۔ ایک ایسی حالت میں کہ ذہن صاف اور قلب گداز ہوں اور طبیعت قبول خیر ونیکی کے لئے تیار ہو۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ ہماری مجلسیں بڑے سائنٹفک اور اخلاقی اصولوں پر ترتیب دی گئی تھیں تاکہ افراد ملت کو بلا کسی مزاحمت کے متواتر حق وانصاف سے رغبت اور ظلم وناانصافی سے نفرت کا سبق ملتا رہے جو اخلاق وآداب انسانی کی تعلیم کا سنگ بنیاد ہے۔

مجلسوں کا یہ معصوم، مفید اور سبق آموز پہلو اس حد تک جاذبیت رکھتا تھا کہ اپنوں کا کیا ذکر ہے دوسرے مکاتیب خیال کے افراد بھی ہماری مجلسوں میں شریک ہوتے تھے اور اس اعتراف کے ساتھ کہ مجلسوں سے انسانیت کے لئے نیکی، سچائی اور مثل ان کے دوسری اچھی علمی اور عملی باتوں کا پیام ملتا ہے۔ ہماری مجلسیں تہذیب کا گہوارہ تھیں اور آداب واخلاق کا ادارہ۔ مقرر اور واعظ لائق احترام سمجھا جاتا اسے قوم کے اندر بلند مقام حاصل تھا۔ لوگ بڑے خلوص اور ادب واحترام کے ساتھ شرکت کرتے۔ صدر مجلس میں اہل علم اور بزرگ حضرات تشریف فرما ہوتے تھے اور جب اس حیثیت کی کوئی فرد آکر مجلس میں بیٹھ جاتی تو پورے مجمع پر ایک کیفیت سی طاری ہوجاتی۔ نوجوانوں اور بچوں کو اتنا پاس ادب ہوتا کہ ہر طرف سکوت کا عالم نظر آتا۔ شور وغل تو بڑی بات ہے بلا ضرورت آپس میں گفتگو نہ ہوتی۔ مختصر یہ کہ ان باتوں سے سوگوارانہ ماحول پیدا ہوجاتا اور روحانی فضا کا احساس ہوتا۔ فضائل سے مصائب تک واہ اور آہ کا ایک عالم رہتا اور اختتام مجلس تک نوبت یہ پہونچتی کہ وفور گریہ اور ازدیاد رقت سے لوگ روتے روتے بیہوش ہوجاتے۔ اس زمانہ میں مجلسیں تعداد میں کم ہوتی تھیں مگر ان خصوصیات کے اعتبار سے جن کا ذکر کیا گیا ہر مجلس عشرۂ محرم کی مجلس ہوتی تھی۔ اور عشرۂ عزا کی تو بات ہی دوسری تھی، محرم کا چاند دیکھتے ہی اہل درد کے گھروں میں صف ماتم بچھ جاتی۔ سبز وسیاہ لباس پہن لئے جاتے، چہرہ حزن وملال کی تصویر ہوجاتا۔ روزمرہ کی زندگی میں نمایاں فرق آجاتا، کھانے پینے اور سونے جاگنے کا ہوش نہ رہتا اکثر ضروری کام بالکل تعطل میں پڑ جاتے۔ ساتویں سے پان کے عادی حضرات اسے بھی ترک کردیتے اور ان تمام امور میں خلوص کا رنگ جھلکتا رہتا۔ مگر ۳۰، ۴۰ سال کے ماضی سے ہٹ کر جب ہماری نظر یں حال کا جائزہ لیتی ہیں تو دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ نیتوں

سے تو عالم الغیب ہی واقف ہے مگر لوگوں سے گفتگو کے بعد میں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ آپ کے سامنے بھی پیش کرتا ہوں۔ آجکل کچھ لوگ مجلسیں اس لئے کررہے ہیں کہ باپ دادا کے وقت سے ہوتی چلی آرہی ہیں لہٰذا اس رسمی سلسلہ کو شماتت ہمسایہ کے خیال وخوف کی وجہ سے جاری رہنا چاہئے۔ گویا خود ان کے خلوص وعقیدت کا انعقاد مجالس میں کوئی دخل نہیں۔ دوسری قسم ان مجالس کی ہے جو اظہار نام ونمود کی خاطر کی جاتی ہیں جن میں تصنع کا اثر اس حد تک غالب رہتا ہے کہ ہر شخص محسوس کرلیتا ہے۔ تیسری قسم ان مجلسوں کی ہے جو بطور مقابلہ کی جاتی ہیں۔ یعنی فلاں نے اتنی بڑی مجلس کی ہے تو ہم بھی کریں۔ امور خیر میں مسابقت ومقابلہ ممدوح ہے اور یہ جذبہ لائق تحسین ہے مگر اکثر و بیشتر ہی دیکھنے میں آتا ہے کہ اپنی منعقد کردہ مجلس کی کامیابی کے لئے دوسری مجلسوں سے ٹکرانا اور انھیں ناکامیاب بنانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس بارے میں مخالفت اور پھر شرمناک حد تک جنگ وجدل اور کچہری عدالت کی نوبت آجاتی ہے۔ اکثر مقامات پر یہ باتیں بھی سننے میں آئیں کہ ایک ہی خاندان کے مختلف گھروں میں دنیا کے سارے معاملات میں اتفاق رہتا ہے۔ شادی بیاہ اور دوسرے موقعوں پر ایک دوسرے کے ساتھ ہر طرح کا تعاون بھی کرتے ہیں مگر اختلاف فقط مجلس وماتم کی حد تک ہے۔ خود شریک ہونا تو غیر ممکن ہے ایک بچے کو بھی جانے کی ممانعت رہتی ہے۔ صد حیف کہ جو بات عام افراد انسانی میں ذریعہ اتحاد واتفاق تھی آج اپنوں ہی کے لئے سبب اختلاف بنی ہوئی ہے۔ نامرادی اور حرماں نصیبی کی اس سے بڑھ کر اور دوسری مثال کیا ہوگی؟ ظاہر ہے کہ جب انعقاد مجالس میں خیر وخلوص کا فقدان ہو اور ایسے دنیاوی محرکات مجلسیں برپا کرنے کا باعث ہوں تو آثار ونتائج بھی ویسے ہی سامنے آتے ہیں۔ مجلسوں میں ہنسی مذاق، جملہ بازیاں، الزام تراشیاں اور ذاتی حملے برابر دیکھنے میں آرہے ہیں جن کے لئے ندامت بھی محسوس نہیں کی جاتی۔ بے حسی کی یہ رو جب زیادہ ترقی کرجاتی ہے تو ذاکر ومقرر پر بھی پھبتیاں کسی جانے لگتی ہیں بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر اقدام کئے جاتے ہیں۔ تقسیم حصص کے موقعوں پر تو اکثر باقاعدہ ہنگامے ہوگئے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان باتوں سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ تقریر وبیان سے سامعین نے ذرا بھی اثر قبول نہیں کیا اور اتنی دیر کی سمع خراشی اور وقت گذاری کا کوئی ماحصل نہ ہوا۔ ان حرکتوں نے مجلس جیسے مقدس اجتماع کی تقدیس کو تباہ کرکے رکھ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری مجلسوں سے برکتیں سلب ہوگئی ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے تقریباً نصف صدی ادھر ایک سال ایسا ہوا کہ الہ آباد میں طاعون وبائی شکل اختیار کرگیا تھا۔ میں بہت کمسن تھا اس لئے دوا علاج کے سلسلہ میں دوا دوش کا کچھ علم نہیں مگر اتنا یاد ہے اور خوب یاد ہے کہ میرے مکان سے ملحقہ مسجد میں بعد نماز عشاء کئی مجلسوں کی بنا رکھی گئی اور بعد مجلس اہل محلہ کی عافیت وسلامتی کی دعا مانگی گئی۔ ابتدائی مجلسیں تو ہمارے بزرگوں کی طرف سے ہوئیں مگر یہ سلسلہ چالیس مجلسوں تک قائم رہا۔ اور ہر روز کسی نہ کسی اہل محلہ کی طرف سے مجلس ہوتی اور تبرک تقسیم ہوتا۔ یہاں تک کہ عطا اللہ کتب فروش، عبدالخالق سبزی فروش اور بابو لال ٹھٹھیری اور مثل ان کے دوسرے لوگوں نے بھی اپنی اپنی جانب سے مجلسیں کرائیں اور یہ کل مجلسیں ہمارے شہر کے بزرگ اور متقی ذاکر جناب نواب حُسّو میاں مرحوم نے پڑھیں۔ ان مجالس کی برکت سے پورے محلہ میں ایک بھی حادثہ نہیں ہوا اور مجلسوں کی شہرت ومقبولیت اتنی بڑھی کہ قومی اخبارات نے اس اطلاع کو نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔

اب مجلسوں میں نہ ویسا خلوص نظر آتا ہے اور نہ ادب و احترام کا انداز ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس معاملہ میں خواص اور عوام دونوں ایک ہی رنگ میں نظر آتے ہیں۔ مذہبی اجتماع کے موقع پر جب ادب وتہذیب سے بے نیازی ہمارا کردار ہوگیا تو پھر انفرادی زندگی میں ہمارے اندر کسی نظم وضابطہ کی تلاش وتوقع تحصیل حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج معاشرہ بد سے بدتر ہوتا جارہا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۱ پر۔۔۔۔۔)

اجازت دیجئے۔ پھر اگر موقع رہا تو ملوں گا۔

کیلی: ''میں تو کل اپنے وطن واپس جا رہا ہوں اس لئے یہ ملاقات آخری ہی سمجھو دوست! لیکن تم مجھے عمر بھر یاد رہو گے اس لئے کہ تم نے عجیب بات بتائی ہے اور ایسی بات بتائی ہے جسے دنیا کے ہر فرد کو جاننا چاہئے۔ مجھے تاریخ سے دلچسپی تو نہ تھی لیکن میں حسینؑ ایسے عظیم اور فخر انسانیت کی تاریخ ضرور پڑھوں گا۔''

پھر ایک دوسرے نے ایک دوسرے کا پتہ نوٹ کیا اور الوداعی جملوں کے بعد رخصت ہو گئے۔ دوسرے دن طیارے پر بیٹھا ہوا کیلی براؤن صرف اور صرف حسینؑ اور یزید کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس واقعے کو تقریباً دس ماہ گذر گئے تھے کہ ایک دن صبح کی ڈاک سے سی چیانگ کو ایک غیر ملکی لفافہ ملا۔ سی چیانگ نے لفافہ کھولا تو انگریزی میں ایک مختصر سا خط ملا جو یوں تھا۔

نیو یارک، ۲۶ نومبر ۱۹۶۲ء

پیارے دوست سی چیانگ!

''امید ہے کہ تم اچھے ہو گے۔ تم سے رخصت ہو کر میں دوسرے ہی دن اپنے وطن کے لئے روانہ ہو گیا تھا اس درمیان میں خط نہ بھیجنے کی معافی چاہتا ہوں۔ واپسی کے بعد سے اب تک میرا مشغلہ صرف اسلامی ہسٹری پڑھنا رہا اور آج میں یہ بات کہنے پر مجبور ہو گیا کہ۔

حسینؑ:۔ فخر انسانیت اور ایک عظیم الشان انسان ہونے کے ساتھ ساتھ مظلوم و شہید و زندہ جاوید ہیں۔''

یزید ننگِ انسانیت ظالم و جابر ہونے کے ساتھ ساتھ انسان دشمن اور خونخوار تھا۔ میں تمہاری اس رہنمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تمہارا کیلی براؤن

نیو یارک۔ ۲۶ نومبر ۱۹۶۲ء

(سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن، لکھنؤ نمبر ۵۰۴ محرم ۱۳۸۷ھ)

❁❁❁

(صفحہ ۳۴ کا بقیہ۔۔۔)

بزرگوں کا احترام، چھوٹوں کا لحاظ یہ سب باتیں قصہ پارینہ ہو گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ہر ایک کو ہر مناسب نامناسب حرکتوں کی پوری چھوٹ مل گئی ہے۔ ان حالات میں بھی امید کی ایک ہی کرن چمکتی نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہمارے مقررین واعظین اور علمائے کرام اس بے راہ روی اور ابتری کو قومی اور مذہبی زندگی کے حق میں مضر اور مہلک سمجھتے ہوں تو جرأت و بیباکی کے ساتھ قوم کے سامنے آئیں اور اس غلط ماحول کے خلاف جرأت مندانہ جہاد فرمائیں۔ ورنہ جو حالات آج اس حد تک بے قابو ہو گئے ہیں وہ آنے والے زمانہ میں حد درجہ مہلک اور تباہ کن ثابت ہونے کا پیش خیمہ ہیں اس لئے کہ وقت تیزی سے بدل رہا ہے اور زمانہ ہر لحظہ غیر متوقع طور پر ایک نئی کروٹ لے لیتا ہے جس کی دھمک سے مضبوط اور مستحکم خیالات بھی متزلزل ہو جاتے ہیں ایسی غیر یقینی صورت حال میں آنے والی نسلیں دنیا کے نت نئے فتنوں سے دوچار ہو کر اپنی راہ سے بہت دور جا پڑیں گی اور اس وقت ان کے احساس مذہبی اور شعور قومی پر بے حسی اور خود فراموشی کے برف کی اتنی دبیز تہ جم چکی ہوگی کہ پھر کسی دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کی گرمی اسے پگھلانے میں ناکام رہے گی۔ مگر اس کے لئے شرط یہ ہے کہ علماء و واعظین و مقررین پہلے اپنے افعال و اقوال کا جائزہ لیں اور اپنی اپنی شخصیت کو عوامی سطح سے بلند کر کے پیش کریں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ انھیں اپنے عارضی ذاتی مفادات کو دیرپا قومی مفاد پر قربان کرنے کے لئے تیار ہونا پڑے گا تاکہ ان کا مثالی کردار افراد ملت کو ان کی جانب کھینچ سکے۔

(ماخوذ از ہفتہ وار سرفراز لکھنؤ فروری ۱۹۷۳ء محرم نمبر صفحہ ۷۹)

❁❁❁